''حاصل گھاٹ'' کے تارکین وطن

عزیزہ سعید، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

Abstract

The people who settle in a new place after leaving their own society they have to face many kind of socio economic and psychological problems. In this article Bano Qudsia's novel "Haasil Ghaat" has been discussed with reference to above mentioned situation.

سفر اختیار کرتے ہوئے انسان اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر ایسی جگہ پڑاؤ ڈالتا ہے جو اس کے لیے اجنبی ہوتی ہے اور یہ اجنبیت سب سے پہلا انسان کو یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ اسی نفسیاتی اثر کے تحت انسان قید مقام سے نکلتا ہے۔ اسی نفسیاتی اثر کے تحت تارک الوطن ہونے والے فرد پر دیگر نفسیاتی اثرات وارد ہوتے ہیں جو بسا اوقات اسے ناامیدی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل کر احساسِ کمتری اور احساسِ شکست تک سے بھی دوچار کر دیتے ہیں۔ علم نفسیات میں اسے Xenophobia کا نام دیا گیا ہے۔

تارکین وطن جہاں Xenophobia کا شکار ہوتے ہیں، وہیں وہ دیگر عمومی مسائل اور اوہام میں بھی گرفتار ہو جاتے ہیں جنھیں محض تارکین وطن سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ مسائل و اوہام تارکین وطن میں شدت ضرور پا سکتے ہیں جیسے ناکامی کا خوف، اخراجات کا خوف، عزت جاتے رہنے کا خوف وغیرہ۔ ادب کسی بھی زبان سے تعلق رکھتا ہو، انسان کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ اردو ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ تاہم اردو ادب میں جہاں اور بہت سے مسائل ہیں، وہیں یہ مسئلہ بھی نظر آتا ہے کہ تارکین وطن، ان کے مسائل، مشکلات، نفسیاتی کیفیات اور جذبات و احساسات کو بیان کرنے سے بہت حد تک قاصر ہے۔ اگرچہ سمندر پار پاکستانی شعر و شاعری میں اس موضوع کو اجاگر کرنے کی ناکام کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن نثر بالخصوص تخلیقی نثر میں اس حوالے سے نہ ہونے کے برابر نمونے ملتے ہیں۔ اردو افسانہ کہنے کو کافی ترقی یافتہ ہے لیکن اس میں بھی تارکین وطن کے مسائل صحرا میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہیں۔ اردو ناولوں میں سے ''حاصل گھاٹ'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں سمندر پار پاکستانیوں یا پاکستانی تارکین وطن کے کردار شامل کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ناول کا بنیادی موضوع اور پلاٹ اس حوالے سے ترتیب نہیں دیا گیا، لیکن جہاں کہیں مشرق اور مغرب کا تذکرہ آیا ہے، وہاں تارکین وطن کے حوالے سے چند مباحث بھی پیش کیے گئے ہیں۔ یہ مباحث دراصل تہذیبی روداد بیان کرتے ہوئے مشرق اور مغرب کا تقابل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن تلاش بسیار ہی سے سہی، تارکین وطن کے بعض المیے اس ناول سے عیاں ضرور ہو جاتے ہیں۔

بانو قدسیہ نے ''حاصل گھاٹ'' کا انتساب ''ہجرت کرنے والوں کے نام'' کیا ہے۔ یہ اقتباس ہی اس امر کا غماز ہے کہ وہ افراد جو معاشی مجبوری، معاشرتی جبر یا خاندانی معاملات کے نتیجے میں اپنے وطن کو خیر باد کہتے ہیں، ان کی کیا صورت ہوتی ہے؟ وہ کس طرح اپنی زمین سے کٹ کر جینے کا ہنر سیکھتے ہیں؟ اور اس ہجرت کے نتیجے میں کیا کچھ گنوا دیتے ہیں؟ چنانچہ ان کے تمام مسائل اور معاملات کو قصہ کی شکل دے کر اجاگر کرنا ''حاصل گھاٹ'' کا بنیادی موضوع قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے نجمہ صدیق کے بیان کردہ اس نتیجے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ''حاصل گھاٹ کا موضوع دو تہذیبوں کا تصادم اور اس کی وجہ سے انسانی زندگی میں پیدا ہونے والی کشمکش ہے۔''[۱] البتہ یہ اختلاف اپنی جگہ پر برقرار رہے گا کہ ''حاصل گھاٹ'' تہذیبوں کے تصادم کو پیش نہیں کرتا بلکہ تہذیبوں کے تقابل کا اظہار یہ ہے جس میں کشمکش کا عنصر محض ہمایوں فرید کی زندگی میں نظر آتا ہے اور وہ بھی رومانی جذبات سے مغلوب ہے۔ ارجمند اور بلال تو اپنی اس ہجرت کے نتیجے میں در آنے والی تبدیلیوں کے نہ صرف خوگر ہو چکے ہیں بلکہ اس حسین جال سے آزادی کا خیال بھی گناہ سمجھتے ہیں اور ارجمند اس حوالے سے زیادہ شدت پسند دکھائی دیتی ہے:

> ''اچھا یوں کرو ارجمند۔۔۔تم دونوں واپس چلو پاکستان۔ وہاں نہ تمہاری لائف ٹف ہو گی نہ بلال کی۔۔۔تمہارے پاس ملازموں کی پلٹن ہو گی اور تمہیں اتنا کام نہیں کرنا پڑے گا۔ بیگم بن کر عیش کرنا۔ بیگماتی نظام وہاں خوب چلتا ہے۔ صبح بارہ بجے اٹھنا، گیارہ بجے بازار کھل جاتے ہیں وہاں گھومنا۔۔۔کافی پارٹیاں، غیبت، چغلی میٹنگ، سکینڈل۔۔۔دھونس شور شرابا۔ آرزوئیں ہی آرزوئیں۔'' ''God Forbid ابو۔۔۔ایسی بری بات منہ سے نہ نکالیں۔ Illiterate fools کی پلٹن رکھ کر مجھے کیا آرام ملے گا۔ توبہ کریں I hate servants۔۔۔''[۲]

ارجمند اور بلال کے پاس امریکہ ہجرت کرنے کی ایک وجہ ہے کہ وہ اپنے وطن میں دولت اور عزت کا وہ معیار نہیں حاصل کر پاتے، جس کے وہ خواہاں تھے اور اپنی اسی خواہش کے تعاقب میں انہوں نے ہجرت آشنا ہونا گوارا کر لیا تھا۔ ان کے برعکس جہانگیر اور شاہدہ کے لیے دولت اور شہرت کوئی مسئلہ نہ تھی لیکن جذبۂ حسد کے تحت شاہدہ نے بھی جہانگیر کے ہمراہ امریکہ جانا طے کر لیا تھا۔

> ''شاہدہ (ہمایوں کی بہو) کو امریکہ جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسے ہر قسم کی آسائش میسر تھی، لیکن ارجمند اور بلال جب سے رخصت ہوئے تھے۔ شاہدہ نے امریکہ کو چیلنج بنا لیا۔ ارجمند اور بلال کے لیے امریکہ ایک مجبوری تھی۔ وہ پاکستان میں اپنے لیے ناکافی دولت اور عزت کما کما کر عاجز آ گئے تھے۔ جہانگیر کے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ اپنے سسر کی ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل کا جنرل منیجر تھا۔ پھر بھی وہ لاہور چھوڑ کر نئی دنیا کی چمک دمک دیکھنے کے لیے رخصت ہو گیا۔''[۳]

ہجرت کا مذہبی حوالہ اپنی جگہ مقدم و معتبر ہے لیکن انسان کی خصلت میں ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بسا اوقات اپنی زمین سے کٹ جاتا ہے اور اصل سے لاتعلق ہو جاتا ہے جب کہ بعض اوقات یہی ہجرت

اس کے لیے ایک مشغلہ کا روپ بھی اختیار کر لیتی ہے اور وہ عواقب و نتائج سے بے پرواہ ہو کر محض حسد یا کسی اور جذبے کے تحت اپنا سب کچھ تج کر یا نہ تج کر بھی دیارِ غیر کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ''حاصل گھاٹ'' میں ان دونوں حوالوں سے ہجرت کا معمولی سا پرتو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہجرت کے کرب اور تارکین وطن کے مسائل کے حوالے سے ''حاصل گھاٹ'' میں بلا واسطہ اظہارِ رائے سے گریز ملتا ہے اور جہاں کہیں اس امر کا بیان بھی ہوا ہے تو وہ ہمایوں فرید کے واسطے سے ہوا ہے۔ ہمایوں فرید کا مقصد بھی اس امر کا اظہار نہیں تھا کہ وہ تارکین وطن کے مسائل پر بحث کرے لیکن اس نے جہاں کہیں مشرق و مغرب کے تقابل کی کوشش کی ہے، وہاں تارکین وطن کے بعض مسائل ضرور اجاگر ہو گئے ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بانو قدسیہ نے مذکورہ ناول میں تارکین کے وطن کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان مسائل کو ہلکی ہلکی ضربیں لگا کر ہمارے اندر اتارنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے غور کیا جائے گا تو صورتِ حال کافی گنجلک اور پیچیدہ دکھائی دیتی ہے اور تارکین وطن کے حوالے سے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اوّل وہ افراد جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں غریب الوطنی کو اپنے گلے سے لگا لیتے ہیں۔ ایسے افراد کی نمائندگی ارجمند اور بلال کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسرے افراد وہ ہوتے ہیں جو محض نمود و نمائش کی خاطر غریب الوطنی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ ایسے افراد کی نمائندگی جہانگیر اور شاہدہ کرتے ہیں۔ تیسرے وہ افراد جنہیں خانگی مجبوریوں کی بنا پر وطن سے دوری اختیار کرنا پڑتی ہے۔ ایسے افراد کی نمائندگی ہمایوں فرید اور اقبال کرتے ہیں۔ جہاں تک تارکین وطن کے مسائل کا تعلق ہے تو اِن سے دوچار ہونے والوں میں یا تو اول الذکر افراد شمار کیے جا سکتے ہیں یا آخر الذکر؛ ثانی الذکر تو ہر جگہ اور ہر مقام پر قیدِ رنج و محن سے آزاد رہتے ہیں۔ چنانچہ اول الذکر طرز کے افراد کے بارے میں بانو قدسیہ ہمایوں فرید کی زبانی بیان کرتی ہیں:

> ''میری گوری بیٹی ارجمند اور اس کا دبلا پتلا لمبا ڈاکٹر میاں اپنے آپ کو ایشیائی نہیں سمجھتے۔ جس طرح ترک نژاد اپنے آپ کو یورپ کا حصہ بنانے پر بضد ہیں، ایسے ہی میری بیٹی اور ڈاکٹر داماد مصر ہیں کہ امریکن سٹیزن ہو جانے کے بعد اب ان پر امریکی مہر پکی ہو گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امریکہ تو بنیادی طور پر تارکین ہی کا وطن ہے، اس لیے وہ بے وطنے نہیں ہیں۔''[۴]

تارکین وطن کے اس رویے اور رجحان کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر سفیر حیدر بیان کرتے ہیں:

> ''حاصل گھاٹ کے مرکزی کردار کا بھی پہلا مشاہداتی نچوڑ یہ تھا کہ اس کے گھر والے مور پنکھ لگا کر ہنس کی چال چلنے میں اپنی عظمت تلاش کر رہے ہیں اور گویا ''بپتسمہ لے کر نو امریکن ہو گئے تھے۔''[۵]

یعنی ایسے تارکین وطن کو بظاہر کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور وہ اپنے نئے ماحول، معاشرے، تہذیب اور طرزِ زندگی سے کسی طرح بھی نالاں اور پریشان نہیں ہیں بلکہ اس امر پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے وطن میں پر آسائش اور سہولتوں سے لبریز زندگی گزارنے والے بھی بات بے بات وطن عزیز پر بگڑنے کو حق بجانب خیال کرتے ہیں لیکن پردیس میں جا کر تکلیف

دہ اور مشینی زندگی گزارنے پر بھی وہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔اس حوالے سے ایک بنگلہ دیشی محقق کے۔ایس فرید لکھتے ہیں:

"Proper adjustment of the immigrants with the host society is a crucial issue and adjustment experience of these immigrants poses major challenge to politicians, practitioners, and researchers. Immigration to a new country is a stressful life event that is associated with cultural shock and requires personal, economic, and social-cultural changes. There is growing consensus on the need to promote immigrants' integration into the labour market and society. Integration of immigrants, however, requires immigrants to adjust psychologically, socio-culturally and economically into the host society."٦

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ارجمند اور بلال کا پہلا اور بنیادی مگر ظاہری تاثر یہی ہے کہ انہوں نے نئے معاشرے کو نہ صرف قبول کرلیا ہے، بلکہ اس میں پیوست ہونے کی بھرپور کوشش میں بھی مگن ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کا یہ رویہ بھی اس معاشرے کی طرح مصنوعی، ظاہری اور کھوکھلا ہے۔ حقیقت میں وہ ایک ایسے طوق کے اسیر ہو چکے ہیں جنہیں اتارنے پر شرمندگی کا احتمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ارجمند بالخصوص اس حوالے سے اہم کردار بن کر ابھرتی ہے:

''ہم ایک دن Left Overs کھاتے ہیں اور سنڈے کو میں کوکنگ کرتی ہوں اور سارے ہفتے کی dishes تیار کر کے فریزر میں رکھ دیتی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ دیکھیے ناں مجھے بھی کام پر جانا ہوتا ہے۔آپ فریزر میں سے کچھ نہ نکالیں اور جو کچھ فریج میں رکھا ہوا ہے، آپ مائیکروویو اوون میں ڈال کر گرم کرلیں۔ ہم ڈسپلن سے organize ہوکر زندگی گزارتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔افسوس میں آپ کی ویسی خدمت نہیں کرسکتی جیسی پاکستان میں کرتی تھی، لیکن امید ہے آپ یہاں کے طریقے سیکھ جائیں گے۔'' ارجمند کے لہجے میں وضاحت ہے جیسے وہ کسی سیمینار سے مخاطب ہو''۔ ۷

ارجمند کا یہ رویہ فطری نہیں بلکہ خود مصور کیا گیا ہے جس کے رنگ اب اترنے والے نہیں کیونکہ انہی رنگوں میں رنگ کر تو وہ امریکن کہلانے کی حقدار قرار پائی ہے وگرنہ اس کا رنگ، نسل، وطن تو انہیں امریکن ثابت ہونے نہیں دیتے۔ یہاں بین السطور اس کا وہ رنج و قلق بھی پوشیدہ ہے (بلکہ صرف یہیں نہیں، ناول میں کئی مقامات پر اس کی اندرونی گھٹن کا احساس ہوتا ہے) جو اس کی روح کا خاصہ ہے لیکن بہت سارے تارکین وطن کی طرح وہ بھی اس

امر کے اظہار سے قاصر ہے کہ یہ نئی زندگی کوئی زندگی نہیں ہے کیونکہ یہ بھی اس نئے وطن کے مزاج کا حصہ ہے کہ یہاں جذبات بے وقعت رہتے ہیں اور خواہ مخواہ کی خدمات فضول گردانی جاتی ہیں۔صرف یہی نہیں ارجمند کے کردار کا ایک اور خاصہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نئے ماحول میں نہ چاہ کر بھی گھسنے کی کوشش میں شدت سے مصروف ہے۔ اسے اپنے یہودی باس کے پاس کام کرنے سے ہچکچاہٹ ہے لیکن ''اپنے'' ہزار ڈالر کی خاطر اس صورتِ حال کو برداشت کرنے سے گریزاں بھی نہیں ہے۔اسی طرح جہاں وہ لباس کے حوالے سے اپنی اقدار کو چھوڑ کر سہولت محسوس کر رہی ہے، وہیں وہ مشرقی خانگی اطوار ترک کرنے پر بھی شرمندہ نہیں ہے۔اس لیے جب ہمایوں فرید اس کے سامنے بلال کے مسائل یا اس کی توصیف کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایک طرف اپنے مسائل اور مشکلات کا تذکرہ لے بیٹھتی ہے اور دوسری طرف اپنے باپ کو کھری کھری سنا ڈالتی ہے:

> ''ابو ایک بات بتائیں۔۔۔''
>
> میں سر میں انگلی پھیر کر پوچھتا ہوں۔۔۔''کیا؟ کیا بات بتاؤں؟''
>
> ''آپ میرے ابو ہیں کہ بلال کے؟۔۔۔آپ کو مجھ سے محبت ہے کہ بلال سے۔''
>
> میں اس کی بات کا جواب نہیں دے سکتا، کیونکہ مجھے بلال پر ترس آتا ہے۔ارجمند سے مجھے پیار ہے،لیکن ارجمند کے رویے میں کچھ ایسی بدلحاظی یا دیانت داری ہے کہ اگر میں بلال کی جگہ ہوتا تو شاید برداشت نہ کر سکتا۔ارجمند ہر معاملے میں اس قدر برابری کی خواہاں ہے کہ اگر اس کا بس چلتا تو جمشید کی پیدائش کا ضامن بلال ہوتا اور قیصرہ کو وہ جنم دے لیتی۔نہ وہ حیاتیاتی فرق سمجھتی ہے،نہ ہی اسے مرد اور عورت کے جداگانہ رولز کی سوجھ بوجھ ہے۔''[۸]

مشرق اور مغرب کی اقدار اور تہذیبی تفاوت ہی درحقیقت تارکین وطن کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔وہ دیارِ غیر کی طرف اس لیے ہجرت کرتے ہیں کیونکہ وہاں پر آمدن کے ذرائع میسر ہیں اور ہر فرد کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا ہے۔اس معاوضے کی خاطر وہ ہر طرح کی دوڑ دھوپ کرنے کے ساتھ ساتھ مشکلات سے نبرد آزما ہونا بھی گوارا کر لیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی زندگی صناعی کا شکار ہو جاتی ہے۔روحانی طور پر وہ اپنی اقدار سے جڑا رہنا چاہتے ہیں لیکن نفسیاتی طور پر وہ اپنی اقدار کو بوجھل تصور کرتے ہوئے آزاد معاشرے میں آزادانہ زندگی گزارنے کے خواہاں بھی ہوتے ہیں۔یہ روحانی اور نفسیاتی کشمکش انہیں بغیر کسی نتیجے پر پہنچائے زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔بقول ڈاکٹر سفیر حیدر:

> ''اس ناول میں مشرق کے انسان کو روحانی زندگی کی علامت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ان کے خیال میں اگر کبھی مشرقی انسان نے مغرب کی سوچ میں ضم ہونے کی کوشش کی بھی تو اس کو مذہب سے ہاتھ دھو کر اور فلاح کے رستے کو چھوڑ کر کوئی منزل نہیں ملے گی۔اس کے نتیجے میں اسے شرمندگی، احساسِ گناہ اور بے حیائی سفر کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''[۹]

چنانچہ ''حاصل گھاٹ'' میں اس روحانی اور نفسیاتی کشمکش کا شکار ارجمند کی ذات دکھائی دیتی ہے جو

شرمندگی اوراحساسِ گناہ سے بالاتر ہوکرلباس اورشوہر کی برابری کے حوالے سے بے حیائی کا سفراختیار کر چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کو کبھی خودغرض قرار دیتی ہے، کبھی ایڈیٹ کہتی ہے جسے امریکہ میں کئی برس رہتے ہوئے یہاں کے موسم سے واقفیت حاصل ہے اور نہ ویلنٹائن ڈے منانے کا طریقہ ازبر ہے۔ نہ اسے سودا سلف لانے کا سلیقہ ہے نہ اہل و عیال کی ضروریات، جذبات اور احساسات کا علم ہے۔ اس کے دل میں بلال کے لیے بھڑاس ہے اور بے پناہ شکایات۔ اس کے باوجود ''اپنی شناخت'' کی دھن اس پر اس قدر سوار ہے کہ وہ ملازمت ترک نہیں کر سکتی اور نہ ہی وطن واپس جانا چاہتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو ناکامی کا خوف ہے اور دوسرا سبب احساسِ کمتری ہے جو کسی طور پر بھی اس سے جدا نہیں ہو پاتا۔ یہ احساسِ کمتری بسا اوقات شعوری لیکن عمومی طور پر لاشعوری طور پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر تارکین وطن کی زندگیوں کا حصہ بن جاتا ہے جس سے وہ کسی طور پر بھی اور کبھی بھی پیچھا چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ چنانچہ ہمایوں فرید اس حوالے سے ایک این جی او کے نمائندے سے ناول میں بالکل بجا کہتا ہے:

> ''آپ پیسے لے لیجیے لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کامیاب نہیں ہوں گے۔۔۔ آپ ان کو شاید حقوق تو دے پائیں، لیکن آپ انہیں محبت اور انصاف نہیں دے سکیں گے۔۔۔ وہ اپنی شکل اور رنگ کا تاوان اندر کے احساسِ کمتری سے ادا کرتے رہیں گے۔''[۱۰]

ہمایوں فرید اُن تارکین وطن کا نمائندہ ہے جو خانگی مجبوریوں (بیٹی، بیٹے، نواسے نواسیوں، پوتے پوتیوں کی محبت) کی بنا پر امریکہ رہنے آیا تھا۔ یہاں آکر اسے جہاں امریکی طرزِ زندگی (جسے اس کی بیٹی مکمل طور پر اختیار کر چکی ہے) کا ادراک ہے، وہیں اپنے وطن سے دور ہونے کا رنج بھی ہے۔ وہ جس طرح اپنے وطن میں تنہا تھا، یہاں آکر بھی تنہائی سے دوچار ہے۔ فرق یہ ہے کہ اپنے وطن میں وہ کنبے کے بغیر زندگی گزار رہا تھا، اس لیے تنہائی کا شکار تھا لیکن یہاں پر بیٹی، داماد، نواسوں کے ہوتے بھی وہ تنہائی سے دوچار ہے۔ اس کی بیٹی اسے بالکل واضح انداز میں باور کرا دیتی ہے کہ وہ اس کی ایسی خدمت نہیں کر سکتی جیسی پاکستان میں کیا کرتی تھی۔ البتہ اپنے شغل اشغال کی خاطر وہ اپنے باپ کی ذات سے فائدہ اٹھا کر بیرون ملک آسانی سے جا سکتی ہے۔ نواسوں کو اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا، داماد بھی اسے وقت نہیں دے پاتا اور بیٹا بھی محض دکھاوے کے لیے اپنے پاس آنے کی خواہش کرتا ہے۔ اگرچہ ہمایوں فرید اپنی اس تنہائی کا اظہار دکھی اور اداس دل سے نہیں کرتا، البتہ یہ ادراک اسے کبھی کبھار لب کھولنے پر آمادہ ضرور کر دیتا ہے۔ اس کا کردار ناول میں کچھ خاص کشش اور جذباتیت کا حامل نہیں ہے بلکہ داستانوی ہیرو کی طرح وہ خود کو حالات کے سپرد کرنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی ہر بات ماننے پر تیار ہے اور اقبال کی خواہش کو ٹھکرانا بھی اس کے بس میں نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مغرب میں آکر بھی مشرقی طریق زیست کو فراموش نہیں کر پایا۔ اس میں اور ارجمند میں یہی فرق ہے کہ ارجمند مشرقی تہذیب کی پروردہ لیکن مغربی تہذیب کی دلدادہ ہے جب کہ وہ دلدادہ بھی مشرقی تہذیب کا ہی ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے امریکہ میں زندگی گزارنا ناممکن تو نہیں لیکن بہت مشکل ضرور تھا۔ اسے خود بھی اِس غریب الوطنی سے چھٹکارا چاہیے لیکن وہ

مناسب بہانہ یا سہارا ڈھونڈنے میں مگن تھا اور اقبال کی درخواست کی صورت میں اسے غریب الوطنی کی اذیت سے نجات حاصل کرنے کی معقول وجہ ہاتھ لگ گئی تھی۔ اگرچہ بانو قدسیہ نے ''حاصل گھاٹ'' میں ہجرت کے موضوع کو تارکین وطن کے مسائل کے حوالے سے پیش نہیں کیا لیکن اس امر سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ مذکورہ ناول تارکین وطن کے بعض معاشرتی، نفسیاتی اور روحانی مسائل کو بہت واضح طریقے پر اُجاگر کرتا ہے۔

حواشی:

۱۔ نجمہ صدیق، ڈاکٹر، ''پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول''، (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۱۳

۲۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۵۱

۳۔ ایضاً، ص ۹۱۔۹۲

۴۔ ایضاً، ص ٦

۵۔ سفیر حیدر، ڈاکٹر، بانو قدسیہ کی ناول نگاری کا تجزیاتی مطالعہ (بحوالہ تصورِ انسان)، مشمولہ: ''تحقیق نامہ''، (لاہور: شعبہ اُردو جی سی یونیورسٹی، شمارہ ۱۷، جولائی ۲۰۱۵ء)، ص ۳۳۳

٦۔ Farid, K.S., *Home Away Home*, Journl Bangladesh Agricultural University, vol 12(2), 2014, pg 345.

۷۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، ص ۹

۸۔ ایضاً، ص ۵۰

۹۔ سفیر حیدر، ڈاکٹر، بانو قدسیہ کی ناول نگاری کا تجزیاتی مطالعہ (بحوالہ تصورِ انسان)، ص ۳۳٦

۱۰۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، ص ۲۷۵

مآخذ:

۱۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

۲۔ سفیر حیدر، ڈاکٹر، بانو قدسیہ کی ناول نگاری کا تجزیاتی مطالعہ (بحوالہ تصورِ انسان)، مشمولہ: ''تحقیق نامہ''، لاہور: شعبہ اُردو جی سی یونیورسٹی، شمارہ ۱۷، جولائی ۲۰۱۵ء۔

۳۔ نجمہ صدیق، ڈاکٹر، ''پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول''، لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۸ء۔